18. M. HABIBUR REHMAN SAHIB,
Hony. Secretary,
Anjuman Taraqqi-e-Urdu,
Himayat Nagar,
HYDERABAD (DECCAN).

رجسٹر نمبر ۹۲۲
ٹیلیفون نمبر ۲۹

ہماری زبان

انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ کا پندرہ روزہ اخبار

قیمت فی پرچہ دو آنے — سالانہ چندہ دو روپے

جلد نمبر ۱۴ | یکم اگست ۱۹۵۵ء | ایڈیٹر۔ قاضی عبدالغفار | ۱۲ ذالحجہ ۱۳۷۴ھ | نمبر ۱۵

دفتری حکومت اور اہل قلم

ہم پہلے بھی کئی مرتبہ اپنی حکومت کو اس امر پر توجہ دلا چکے ہیں کہ آزاد ہندوستان میں نہ صرف یہ کہ اہل قلم اور ادیبوں کے حقوق کی حفاظت ضروری ہے بلکہ بڑی ضرورت یہ بھی ہے کہ سرکاری عدالتوں میں جب ایسے مقدمات پیش ہوں جن کا تعلق اہل قلم اور ادیبوں سے ہو تو محض حاکمان عدالت کی رائے پر (جو عموماً کوئی ادبی ذوق نہیں رکھتے) ان فیصلوں کا انحصار نہ رہے۔ ہماری زبانوں کے ادب میں فحش، ابتذال اور عریانی کی بحث بہت عرصے سے جاری ہے اور کبھی کبھی ایسے مقدمات عدالتوں میں بھی آتے ہیں جن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کسی کتاب یا مضمون میں کس حد تک عریانی اور ابتذال پایا جاتا ہے۔

ادب اور آرٹ کے اندر ابتذال اور جائز حقیقت نگاری کی سرحدیں ایک دوسرے سے بہت قریب ہیں اور سوائے آرٹسٹ اور ادیب کے کوئی یہ فیصلہ نہیں کر سکتا کہ آرٹ کے نقطۂ نظر سے ایک سرحد کہاں ختم ہوتی ہے اور دوسری کہاں شروع ہوتی ہے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ بعض اوقات عدالتوں نے اس نازک فرق کا تعین کرنے میں غلطیاں کی ہیں۔ اور یہ غلطیاں ہوتی رہیں گی جب تک کہ قانون میں ادیبوں کی کسی ذمہ دار کمیٹی کا مشورہ ضروری قرار دیا جائے۔

حال ہی میں برطانوی پارلیمینٹ میں خود اہل قلم اور ادیبوں کی جانب سے ایک انسدادی قانون کا مسودہ پیش کیا گیا ہے جس کا ضروری اقتباس ہم "معاصر افکار" کراچی کے صفحات سے ذیل میں نقل کرتے ہیں۔

"برطانوی مصنفین کی ایک کمیٹی ان دنوں "ابتذال" کے مفہوم کو متعین کرنے پر غور کر رہی ہے۔ اس کمیٹی سے برطانوی ناشرین اور پارلیمینٹ کے بعض اراکین بھی تعاون کر رہے ہیں۔ لغت میں ابتذال کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے: "جو چیز گندی، کراہت انگیز، ناشائستہ، ذلیل ہو۔"

اب ابتذال کی نئی تعریف کرنے کی جو کمیٹی مقرر کی گئی ہے اس نے ایک بل مرتب کیا ہے جس نے ابتذال کے مذکورہ بالا پہلو کے ساتھ خوف، بے رحمی اور تشدد کو بھی شامل کرنے کی سفارش کی ہے۔ مجوزہ بل کا مقصد یہ ہے کہ برطانوی قانون میں "ابتذال" اور کی اشاعت کے متعلق جو تشریح کی گئی ہے ان کو تبدیل کیا جائے

یہ کولف تصاویر اور اشاعت میں گندی اور عریاں چیزوں سے متعلق ہیں

کمیٹی "ابتذال" کی تعریف میں توسیع کے جو اقدامات اختیار کرنے کی کوشش کر رہی ہے، اس کا یہ مقصد نہیں کہ سنسر کو پہلے سے زیادہ اختیارات حاصل ہوں۔ مجوزہ بل میں مصنفین اور ناشروں کو اپنی صفائی کے لئے پہلے سے زیادہ مواقع دیے جانے کی سفارش کی گئی ہے کیونکہ بعض مجسٹریٹوں نے سنجیدہ ادبی نگارشات کو بھی ابتذال سے آلودہ قرار دیا ہے۔ کمیٹی نے بے رحمی و تشدد کو ابتذال کی تعریف میں لانے کی جو سفارش کی ہے اس کا محرک یہ ہے کہ بچوں کے لئے "سنسنی خیز مطبوعات" جیسی ان امور کو وسیع پیمانے پر پیش کیا جا رہا ہے جس سے ان کے فکر و نظر کے بے راہرو ہونے کے خدشات ظاہر کئے گئے ہیں۔

بے رحمی اور تشدد سے متعلق مطبوعات کے خلاف قانونی کارروائی میں یہ رکاوٹ محسوس کی گئی ہے کہ موجودہ قوانین کا صرف جنسی معاملات کے اظہار میں، ابتذال و عریانی پر اطلاق ہوتا ہے اور "خوفناک مطبوعات" اس کے تحت نہیں آتیں۔ گو ایسی مطبوعات کو بچوں کے لئے تباہ کن سمجھا جاتا ہے۔ لیکن اگر ان میں جنسی عنصر نہ ہو تو وہ قانون کی گرفت سے محفوظ رہتی ہیں۔

برطانیہ میں مطبوعات کے متعلق پولیس اور حکومت کی طرف سے اکثر ابتذال کی شکایت کے ساتھ مقدمات ہوتے رہتے ہیں اور بعض مسلمہ اور دیرینہ ادبی تصانیف کو بھی مبتذل قرار دے کر بعض علاقوں میں ممنوع قرار دیا جاتا ہے اور ناشرین کو سزائے جرمانہ دی جاتی ہے

مصنفین کی طرف سے جو نیا بل مرتب کیا گیا ہے اس کو برطانوی وزارت داخلہ نے ہمدردی کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ برطانیہ میں پولیس اسی وزارت کا ایک شعبہ ہے۔ نئے بل کے تحت عدالتوں کو کسی کتاب یا تصویر کے "عمومی مقصد" کو متعین کرنا ہوگا اور کسی کتاب کے متعلق ادھر ادھر کے چند اقتباسات کی روشنی میں یہ فیصلہ نہیں کیا جائے گا کہ وہ مبتذل ہے یا نہیں۔ عدالتوں کو اس امر پر بھی غور کرنا ہوگا کہ زیر نظر تصنیف کس قسم کے لوگوں کے مطالعہ میں آئے گی۔ اس کے ساتھ عدالتیں مصنف اور ناشر کی عام شہرت کو بھی پیش نظر رکھیں گی۔

موجودہ قوانین کے تحت بیشتر مبتذل کتابوں پر سائنسی اور طبی نقطۂ نظر سے بحث کی جا سکتی ہے۔ لیکن مجسٹریٹ فنی اور ادبی نقطۂ نظر سے ماہرین کے خیالات تسلیم کرنے سے انکار کر دیتے ہیں۔ مصنفین اس تضاد کو دور کرنے پر زور دے رہے ہیں۔ اکثر مصنفین اور ناشرین نے اس بل کی حمایت کی ہے۔ لیکن اخبارات و جرائد نے یہ اعتراض کیا ہے کہ اس طرح سنسر کے ہاتھ میں مزید اختیارات آجائیں گے۔ اس سلسلے میں انھوں نے ایڈگر ایلن پو کی نگارشات پیش کی ہیں جو خوفناک سربستہ رازوں اور دہشت سے متعلق ہیں۔ ایک اخبار نے یہ مثال پیش کی ہے کہ بعض اخبارات نے مسولینی کے پھانسی پانے کے متعلق جو تصویر شائع کی تھی وہ بھی مجوزہ بل کے تحت قابل گرفت ہوگی کیونکہ اس میں مسولینی کا سر نیچے کی طرف تھا، اور یہ تصویر دہشت ناک تھی۔ اس کا یہ جواب دیا گیا ہے کہ مسولینی کے لئے یہ سزا سیاسی نقطۂ نظر سے موزوں تھی۔ اس لئے یہ تصویر قابل گرفت نہیں ہوگی۔ اسی طرح نازی جنگی مجرموں کی سزایابی کی تصاویر گو امریکی جرائد میں شائع ہو چکی ہیں لیکن برطانیہ میں ان کو "بے حد خوفناک" قرار دے کر شائع نہ کیا گیا حالانکہ ان تصاویر کو خاص تاریخی اہمیت حاصل تھی۔ اسی سلسلے میں یہ رائے ظاہر کی گئی ہے کہ "مبتذل اور غیر مبتذل میں بے حد باریک فرق ہے۔ اس کا انحصار ذوق اور عادات پر ہوتا ہے اور اس کو محض قوانین کے تابع نہیں کیا جا سکتا۔"

اسی قسم کی کوئی کوشش ہندوستان کے اہل قلم اور مصنفین کے جائز حقوق کی حفاظت کے لئے بھی ضروری ہے۔ ورنہ ایک طرف تو ہماری ملکی زبانوں کے ادب کا کوئی صحیح معیار قائم نہ ہو سکے گا اور دوسری طرف عدالتوں میں اہل قلم کے ساتھ ناانصافیوں کا سلسلہ جاری رہے گا۔

جہاں تک ادب میں ابتذال کو روکنے کا مسئلہ ضروری ہے۔ اسی کے ساتھ یہ امر بھی کچھ کم تعجب انگیز نہیں کہ حکومت نے ابھی تک اس مخرب اخلاق لٹریچر کے متعلق کوئی موثر اقدام نہیں کیا ہے جو ہر روز غیر ممالک اور خصوصاً امریکہ سے ہندوستان کے بازاروں میں آ رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس کثرت کے ساتھ اس قسم کا لٹریچر ہمارے ملک کے کتب فروشوں کی دوکانوں پر نظر آتا ہے اس کے مقابلے میں ملکی زبانوں کے اہل قلم کی لغزشیں بہت ہی کم ہوتی ہیں ——— ہم خاص طور پر ہندوستان کی پارلیمنٹ کے اراکین کو توجہ دلاتے ہیں کہ وہ اس مسئلہ کو اٹھائیں اور ان حالات کی اصلاح کے لئے کسی انسدادی قانون کا مسودہ پارلیمنٹ میں پیش کریں ———

ہلکے ہلکے اشارے

—— ہم سے ایک نامہ نگار سوال کرتے ہیں کہ ڈاک میں جو خطوط روانہ کئے جائیں ان پر پتہ اردو کے بجائے انگریزی میں کیوں لکھا جائے۔

—— حقیقت تو یہی ہے کہ اردو زبان کی اشاعت کے لئے اصولاً پتے اردو ہی میں لکھے جائیں لیکن حقیقت یہ بھی ہے کہ جن خطوط پر اردو میں پتے لکھے جاتے ہیں ان میں سے بہت سے اپنی منزل مقصود پر نہیں پہنچتے اور اس لئے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خطوط کا صحیح پتہ پر پہنچنا ضروری ہے یا اردو میں پتہ لکھ کر اردو کی اشاعت؟

—— اصولاً ایک بات صحیح ہے اور عملاً دوسری!

—— بحوالہ معاصر افکار کراچی:-

کراچی ۱۰ جون۔ معلوم ہوا ہے کہ انجمن ترقی پسند مصنفین کا دفتر جو گزشتہ جولائی کو حکومت پاکستان نے سیل کر دیا تھا۔ اب کسی پولیس انسپکٹر کو الاٹ ہو گیا ہے۔ کراچی میں صرف یہی ایک دفتر تھا جو ادبی اور ثقافتی کاموں کا مرکز تھا...... انجمن کی لائبریری اور دیگر قیمتی دستاویزیں اب تک پولیس کے قبضے میں ہیں بقول اخبار جنگ حکومت کی اس ستم ظریفی پر ایک شاعر نے اپنے تاثرات اس طرح ظاہر کئے ہیں:-

ہوا اہل کار پولس کو الاٹ دفتر علم
یہ انتظام یگانہ قرار پایا ہے
مصنفین ترقی پسند کا دفتر
خدا کی شان کہ تھانہ قرار پایا ہے

—— گویا پاکستان میں ترقی پسندی کا ڈانڈا کس خوبی اور آسانی کے ساتھ ترقی پسندی سے مل جاتا ہے!!

—— لکھنؤ، ۷ جولائی۔ سلطانہ حیات صاحبہ نے اخباروں کو بیان دیتے ہوئے بتایا کہ ہمیں باوثوق ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ صوبے کے بعض اسکولوں میں گورنمنٹ کا سرکلر اے ... مورخہ ۲۰ اکتوبر ۱۹۵۷ء اب تک نہیں پہنچا۔ یہ وہی سرکلر ہے جس کی بنا پر ایک اسکول میں چالیس یا ایک کلاس میں دس ایسے طالب علم ہوں جن کی مادری زبان اردو ہو اسکولوں کے ذمہ داروں کو اردو میں تعلیم دینے کا انتظام کرنا ہوگا۔

موصوفہ نے حکومت سے اپیل کی ہے کہ وہ ایسے اہم سرکلر کو تمام یوپی کے اسکولوں کو بھجوا دیں تاکہ ہر جگہ اردو پڑھنے والے بچے اس سرکلر سے پورا پورا فائدہ اٹھا سکیں۔ سلطانہ حیات صاحبہ نے عوام سے بھی اپیل کی ہے کہ جن اسکولوں میں یہ سرکلر نہیں پہونچا ہے ان اسکولوں کے نام اور پتہ سے انجمن ترقی اردو اتر پردیش نظیرآباد لکھنؤ کو مطلع کر دیں تاکہ یہ سرکلر ان اسکولوں میں حکومت کی طرف سے بھجوانے کی کوشش کی جائے۔

—— سبحان اللہ! یہ سرکلر بھی عجب قسم کا سست رفتار سرکلر ہے کہ ۲۰ اکتوبر ۱۹۵۷ء کو روانہ ہو کر بعض اسکولوں میں جولائی ۱۹۵۸ء تک بھی نہیں پہنچا!!

—— ماہنامہ فروغ اردو (لکھنؤ) کے صفحات سے ہم حسب ذیل عبارت نقل کرتے ہیں:-

(۱) کس کس کی شکایت کی جائے اور کہاں کہاں کی جھیلی جائے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کی وسیع سرزمین اردو زبان کے لئے دن بدن تنگ ہوتی جا رہی ہے۔ حامیان اردو کی سست رفتاری اردو کی ترقی کی راہ میں رکاوٹوں کے پہاڑ کھڑے کر رہی ہے چنانچہ اب لکھنؤ یونیورسٹی کے ارباب حل و عقد بھی اردو کشی کی مہم میں شریک ہو گئے ۱۹۵۸ء کے نئے تعلیمی سال سے گریجویٹ کلاسز میں چند لازمی مضامین کا اضافہ کیا گیا ہے۔ ان میں ایک پرچہ ہندوستان کی علاقائی زبان کا بھی ہے جس میں صرف بنگالی، مرہٹی اور تامل کو شامل کیا گیا ہے اور اردو کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ اس سے بڑھ کر ستم ظریفی کیا ہوگی کہ اردو کے مرکز میں اردو ہی کو علاقائی زبان نہ سمجھا جائے اور مخالفین اردو کے اس مقولہ کو عملی جامہ پہنایا جائے کہ "اردو کوئی زبان نہیں ہے" جمہوریت کا پرچار کرنے والوں کی یہ جمہوریت کشی اور تنگ نظری جن رجحانات کی نشاندہی کرتی ہے وہ صد درجہ مضرت رساں ہیں اور ملک کی ترقی میں بڑی رکاوٹ ثابت ہوں گے۔

——— ایک ہاتھ سے دینے اور دوسرے ہاتھ سے واپس لینے یعنی ایک تولہ دینے اور ایک سیر واپس لینے کا جو سرکاری مسلک اتر پردیش میں اختیار کیا گیا ہے اس کی حقیقت ہر روز واضح ہوتی رہتی ہے۔ فروغ اردو کی لکھنؤ کمیٹی نے کوئی نیا انکشاف تو نہیں کیا۔ تین سال سے ہم اتر پردیش کی حکومت کے اس طرز عمل سے بخوبی روشناس ہو چکے ہیں۔

——— انگریزی زبان میں ادنیٰ مہربانیوں اور دفع الوقتی کو SMALL MERCIES کہتے ہیں۔ ابتدائی مدارس میں بچوں کے داخلے اور اردو کی تعلیم کے متعلق جن مہربانیوں کا اعلان ہوتا رہتا ہے ان کا شکریہ ادا کرنے میں ہم کبھی تساہل نہیں کرتے۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ درخت کے پتوں پر تو پانی چھڑکا جا رہا ہے لیکن درخت کی جڑ کاٹی جا رہی ہے! اس کا علاج سوائے اس کے کچھ نہیں کہ اردو زبان کی دستوری حیثیت کو مستحکم کیا جائے اور اسے علاقائی زبان تسلیم کرایا جائے۔ باقی جو چھوٹی چھوٹی رعایتوں کے وعدے کئے جاتے ہیں ان کے متعلق شاعر کی زبان سے ہم صرف اتنا ہی عرض کر سکتے ہیں۔

ترے وعدے پر جئے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

——— رانچی ۱۰ جون۔ حکومت بہار نے اپنے ایک پریس نوٹ میں کہا ہے کہ ویمنس (خواتین) ٹریننگ کالج میں اردو کی جو لازمی تعلیم دی جاتی ہے۔ اس کے متعلق بعض اخباروں میں مخالفت کی گئی ہے جس کی طرف حکومت کی توجہ مبذول ہوئی ہے۔ حکومت یہ واضح کر دینا چاہتی ہے کہ اردو کی تعلیم ٹیچر اور طلبا دونوں کے لئے سودمند ہے اور اسی لئے حکومت نے اس کی تعلیم کا ضروری انتظام کیا ہے۔

عورتوں کے لئے ٹریننگ کلاسوں میں پریپریٹری کلاس ہوتا ہے جو بالغ خواتین کے لئے مخصوص ہے۔ اس میں مڈل اسٹینڈرڈ تک کی تعلیم دی جاتی ہے اور عورتوں کو اس قابل بنایا جاتا ہے کہ وہ ٹریننگ کلاس میں داخلہ لے سکیں۔ پریپریٹری کلاس کا کورس بالکل مڈل کلاس کے کورس جیسا نہیں ہوتا ہے۔ حکومت یہ ضروری سمجھتی ہے کہ کل پرائمری اسکولوں کے ٹیچر ہندی کے ساتھ ساتھ کم از کم ایک علاقائی زبان ضرور جانیں تاکہ لڑکوں کو ان کی مادری زبان میں تعلیم دی جا سکے۔ اور کچھ ایسے لڑکے ہوتے ہیں جن کی مادری زبان ہندی نہیں ہوتی ہے۔

اسی خیال کے تحت مظفرپور ٹریننگ کلاس پریپریٹری کلاس میں طالبات کو اردو کی تعلیم دی جاتی ہے اور یہ ظاہر ہے کہ ہندی کے بعد اس علاقہ میں اردو ہی کا نمبر ہے۔ اس لئے جب تک اردو کی تعلیم نہیں دی جاتی ہے اس وقت تک پرائمری اسکولوں کی استانیاں اپنے فرائض اچھی طرح انجام نہیں دے سکتی ہیں۔

ایک علاقائی زبان جاننا پرائمری ٹیچروں کے لئے ضروری ہے اور اسی غرض سے حکومت نے اردو کی لازمی تعلیم کا انتظام کیا ہے جو ٹیچر اور طلبا دونوں کے لئے سودمند ہے۔

——— کہیں نہ کہیں اور کسی نہ کسی طرح ہمارے دوستوں کو اردو کی حیثیت تسلیم ہی کرنی پڑتی ہے۔ بہار کی حکومت سے عرض ہے کہ اگر علاقائی زبان کی تعلیم کے متعلق یہ اصول ٹریننگ کالج تک قبول ہے تو اسی پر تعلیم کے دوسرے شعبوں میں عمل کرنا کیوں ناپسندیدہ ہے! ——— بہرحال یہی کیا کم ہے کہ علاقائی زبان کی حیثیت سے بہار میں اردو کا نام تو آیا!

——— لندن ۲۹ جون۔ مولانا آزاد جو کہ انڈیا لائبریری سے متعلق برطانوی حکام سے گفت و شنید کرنے کے لئے لندن آئے ہیں یہاں اپنی زبان اردو بولنے ہی کو ترجیح دیتے ہیں۔ اگرچہ مولانا آزاد بھی انگریزی جانتے ہیں اور روانی کے ساتھ انگریزی بول لیتے ہیں پھر بھی لائبریری کے مستقبل پر بات چیت کرتے ہوئے اردو ہی بولنے پر زور دیتے ہیں۔ مولانا آزاد سے قریبی تعلق رکھنے والے حلقوں کا جن میں بھارت کے سکریٹری تعلیمات مسٹر ہمایوں کبیر بھی شامل ہیں یہ کہنا ہے کہ مولانا آزاد اس خیال کے حامی ہیں کہ جب یورپین ممالک کے لوگ ایشیائی ملکوں میں پہنچتے ہیں تو وہ اپنی زبان بولتے ہیں۔ گفتگو کرتے ہیں پھر کوئی وجہ نہیں ہے کہ ایشیائی لوگوں سے یورپین مدبرین ان کی زبان میں گفتگو کریں۔

——— روس میں بھارت کے وزیر اعظم اردو بولتے ہیں انگلستان میں وزیر تعلیم اردو زبان میں بات چیت کرنے پر اصرار کرتے ہیں ——— پھر ملٹن جی شکایت نہ کریں تو کیا کریں!!

——— ہم دیکھتے ہیں کہ قابل قدر اردو زبان کے ساتھ یوپی، مشرقی پنجاب اور پٹیالہ یونین کی گورنمنٹیں سوتیلی ماں کا سلوک کرتی ہیں اور

چاہتی ہیں کہ اگر ان کے اختیار میں ہو تو یہ ان صوبہ جات میں اردو کا بولنا پڑھنا اور لکھنا قانوناً جرم قرار دیں۔ مگر اردو کی مقبولیت کا کیا عالم ہے؛ اس کا اندازہ مشرقی پنجاب کی یونیورسٹی کے ذیل کے نتائج سے لگایا جا سکتا ہے

اس یونیورسٹی میں اس سال ادیب، ادیب عالم اور ادیب فاضل کے امتحان میں ۱۲۰ طالب علم کامیاب ہوئے اور ان ۱۲۰ طلبا میں صرف ۲۰ تو مسلمان تھے اور ۱۰۰ ہندو اور سکھ۔ یعنی مسلمانوں کے مقابلے پر اردو زبان میں پانچ گنا ہندوؤں اور سکھوں نے دلچسپی لی۔

ـــــ ان اعداد و شمار کی موجودگی میں یہ کہنا اپنے ضمیر پر کتنا ظلم ہے کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے یا اردو شمالی ہند میں ایک زندہ زبان نہیں اور پنجاب، یو۔پی۔ اور بہار کے صوبہ جات کی گورنمنٹوں کا اردو کو ایک علاقائی زبان تسلیم نہ کرنا کس قدر بے انصافی اور لٹریچر پر ظلم ہے جس پر مرکزی گورنمنٹ کو توجہ کرنی چاہیے۔ ہماری خواہش ہے کہ مرکزی گورنمنٹ کی ایجوکیشن منسٹری جرات کا ثبوت دیتے ہوئے شمالی ہند کے ان صوبہ جات کو اردو کو ایک علاقائی زبان تسلیم کرنے پر مجبور کرے

(ریاست دہلی)

ـــــ پنجاب یونیورسٹی ہندوستان کی ایک بڑی اور مشہور یونیورسٹی ہے جس نے جہاں ہزاروں ڈگری ہولڈر پیدا کئے وہاں اس نے اردو اور فارسی کے امتحانات لے کر اور پھر یہ سہولت دے کر کہ اگر علوم مشرقی کا سند یافتہ صرف انگریزی میں ڈگری لینا چاہے تو صرف یہی ایک مضمون پڑھ کر میٹرک، ایف اے اور بی۔ اے تک کر سکتا ہے۔ چنانچہ ایسے نوجوانوں کی تعداد کم نہیں ہے جنہوں نے اردو اور فارسی امتحانات دے کر ایل ایل بی تک کے امتحانات دئے۔ اس یونیورسٹی نے اس سال سے اردو کے امتحانات میں شرکت کے لئے یہ قید عائد کی ہے کہ ادیب فاضل کا امتحان اس وقت تک کوئی نہیں دے سکتا جب تک یونیورسٹی کے دوسرے امتحانات ادیب اور عالم کا امتحان پاس نہ کرے۔ اس سے قبل کوئی پابندی نہیں تھی بلکہ ہر شخص کو یہ آزادی حاصل تھی کہ وہ پنجاب یونیورسٹی کے تینوں امتحانات میں سے جس امتحان میں چاہے شرکت کر سکتا ہے۔ لیکن اب اس نئی پابندی نے براہ راست ادیب فاضل کے طلباء کے لئے بڑی مشکل پیدا کر دی ہے اور وہ مجبور ہو گئے ہیں کہ اہلیت و قابلیت ہونے کے باوجود بھی اپنے دو سال برباد کریں اور ادیب اور ادیب عالم کے امتحان پہلے پاس کریں پھر ادیب فاضل کے امتحان میں بیٹھیں۔ (تیج)

ـــــ ڈھاکہ ۱۰ جولائی۔ وزارت نے حکم دیا ہے کہ مشرقی بنگال میں بنگالی زبان بولنے والے طلباء کے لئے ابتدائی مدارس میں اردو کی تعلیم لازمی نہ ہو اور فوراً اس حکم کی تعمیل کی جائے۔ مسلم لیگی وزارت نے اردو کی تعلیم کو لازمی قرار دیا تھا مگر اب اس نئے حکم سے اردو بولنے والے طلباء کے لئے بنگالی زبان کی تعلیم لازمی کر دی گئی ہے۔

ـــــ اردو زبان کے ساتھ پاکستان میں جو عمل ہو رہا ہے کیا اس کے بعد بھی ہندوستان میں ہمارے احباب یہی فرمائے جائیں گے کہ اردو پاکستانی زبان ہے؟

ـــــ لکھنؤ ۱۱ جولائی۔ سلطانہ حیات جوائنٹ سکریٹری انجمن ترقی اردو اتر پردیش نے وزیر تعلیم ہرگوبند سنگھ جی سے ملاقات کی اور اردو کے متعلق شکایتوں کو پیش کیا اور کہا کہ صوبہ کے بعض بعض مقامات پر ابھی تک گورنمنٹ کا اسکولوں میں دوبارہ اردو (تعداد کی شرط کے ساتھ) جاری کرنے کا آرڈر نہیں پہونچا۔

وزیر تعلیم نے اس شکایت کو سنا اور کہا کہ ہم صوبہ کی میونسپلٹیوں کے نام دوبارہ ۲۰ اکتوبر ۵۳ء کی گشتی جاری کریں گے اور اس نوٹ کے ساتھ کہ یہ حکومت کا حکم ہر اسکول میں پہونچا دیا جائے

ـــــ دو سال بعد تو یہ معلوم ہوا کہ سرکار کے احکام بعض مدارس میں تو پہنچے ہی نہیں اب دوبارہ ان کے اجرا میں دو برس اور لگ جائیں تو کیا تعجب ہے اور اس عرصے میں نئے الیکشن کے بعد معلوم نہیں اتر پردیش کی وزارت میں کیا انقلاب آ جائے!

ـــــ جب وزیر موصوف کے سامنے دوسری شکایت رکھی گئی کہ اسکولوں میں اردو جاری ہو جاتی ہے مگر بازار میں اردو کی کتابیں نہیں ملتیں تو انھوں نے کہا کہ حکومت اردو کے کورس کی کتابوں کو مہیا کرنے کی ذمہ دار ہے اور بازاروں میں اردو کی کتابوں کی ملنے کی وجہ نہیں ہے کہ حکومت نے وہ کتابیں شائع نہیں کرائی ہیں بلکہ اصلی سبب اردو کی کتابوں کا بازار میں مانگ نہ ہونا ہے

بک سیلرس کورس کی اور کتابیں تو پبلشرس سے لے لیتے ہیں مگر اردو کی کتابیں پڑی رہ جاتی ہیں اور اس طرح پبلشرس جو روپیہ اردو کی کتابوں پر لگا دیتے ہیں وہ کتابوں کی بکری نہ ہونے کی وجہ سے رکا پڑا رہتا ہے۔ اور اسی بنا پر پبلشر اور بک سیلرس اردو کی کتابوں کو عوام کے لئے مہیا نہیں کرتے اور اس میں حکومت کا کوئی قصور نہیں ہے

اور اب اس شکایت کو اس طرح رفع کیا جا سکتا ہے کہ جن مقامات پر اردو کی کتابیں نہیں ہیں وہاں کے ضرورت مند حضرات اپنے مقامی بک سیلرس سے کہیں کہ وہ ان کو کتابیں منگا دیں اور یا پھر کتابوں کی ضرورت کا علم پبلشر کو ہو جائے تو وہ براہ راست کتابیں مہیا کر دے گا۔

وزیر تعلیم نے ان شکایات کا تسلی بخش جواب دیا اور ان کا رویہ اردو سے بہت ہمدردانہ تھا سلطان حیات صاحب نے اپنے بیان میں کہا ہے کہ امید ہے کہ حکومت کی طرف سے میونسپلٹیوں کو مادری زبان والا سرکلر عنقریب دوبارہ بھجوا دیا جائے گا اور پھر میونسپلٹیاں اپنے متعلق اسکولوں کو یہ حکم جاری کر دیں گی۔ اگر پھر بھی کوئی اسکول ایسا بچ جائے جہاں حکومت کا یہ حکم نہ پہنچے تو اردو پڑھنے والے طلبا کے سرپرستوں کو چاہئے کہ وہ انجمن ترقی اردو اتر پردیش نظر باغ لکھنؤ کو فوراً مطلع کریں۔ اگر دفتر سے ان کو ایک ہفتہ کے اندر اندر جواب نہ موصول ہو تو دوبارہ لکھیں۔ اگر بک سیلرس اردو کی کورس کی کتابیں نہ منگا سکیں تو دفتر انجمن ترقی اردو کو آرڈر دیجئے تاکہ یہ آرڈر پبلشرس کو پہنچا کر کتابیں بھیج دی جائیں۔ پتہ بالکل صاف اور مکمل لکھا جائے۔

—— گویا ابھی امکان یہ باقی ہے کہ دوبارہ اجرا ہونے کے بعد بھی یہ احکام مدرسوں میں نہ پہنچیں!! اور صوبائی انجمن کو پھر وزارت تعلیمات میں گھنٹی بجانی پڑے!

—— رہا معاملہ کورس کی کتابوں کا تو یہ عجیب تضاد سمجھ میں نہ آیا کہ ایک طرف تو وزیر تعلیم فرماتے ہیں کہ "حکومت اردو کی کتابوں کو مہیا کرنے کی ذمہ دار ہے" اور دوسری طرف یہ بھی فرماتے ہیں کہ اگر اردو کے کورس کی کتابیں نہیں ملتیں تو یہ قصور حکومت کا نہیں!! —— اب ہم کیا عرض کریں۔ سرکار یوں فرمائے تو وہ بھی صحیح اور یوں فرمائے تو وہ بھی غلط نہیں!

—— "اردو کا حشر کیا ہوگا" یہ ہم سے پوچھا جاتا ہے حالانکہ یہ خود سے پوچھنے کی بات ہے —— اس قسم کے سوالات کرنے والوں میں زیادہ تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو حشر کے قائل نہ ہونے کے باوجود حشر کے انتظار میں بیٹھے ہوئے ہیں اور اردو کے لئے کچھ کرنا نہیں چاہتے۔

زبانوں کا جو حشر ہوتا ہے وہی اس کے بولنے والوں کا بھی ہوتا ہے اس لئے یہ پوچھنے والے کہ اردو کا حشر کیا ہوگا خود فیصلہ کر لیں کہ اردو کے ساتھ ساتھ ان کا حشر کیا ہوگا۔

کتاب اور مصنف

(از: حاجی محمد زبیر۔ مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

کتاب لکھنے والے کو مصنف کہتے ہیں لیکن سچ پوچھئے تو مصنف کتاب کا خدا ہوتا ہے۔ کتاب کے کاغذی جسم میں وہی روح پھونکتا ہے، اسی کے افکار و خیالات کتاب کے اوراق پر بکھرے نظر آتے ہیں۔ اگر ان خیالات کو کتاب سے نکال دیا جائے تو وہ بے جان اور بیکار ہو کر رہ جائے۔ مصنف کی طرح کتاب بھی جسم اور روح رکھتی ہے۔ کتاب کا جسم جلد اور روح مضمون ہے اسی روح کے ذریعہ وہ اپنے خالق کے خیالات و جذبات دوسروں تک پہونچاتی ہے اور اسی سے کتاب کی قدر و قیمت کا اندازہ کیا جاتا ہے۔ کتاب کا مضمون جس قدر مفید اور دلچسپ ہوگا اتنی ہی اس کی مانگ زیادہ ہوگی۔ آج کل علم کی جستجو اور تحقیق جتنی عام ہوتی جا رہی ہے اسی قدر مضمون کی اہمیت بھی بڑھ گئی ہے اور اب کتب خانوں میں کتابوں کی تلاش اور مانگ بھی زیادہ تر مضمون ہی کے نام سے کی جاتی ہے۔ مضمون کی اس بڑھتی ہوئی ضرورت کی وجہ سے کتابوں کی درجہ بندی (کلاسیفکیشن) بھی مضمون وار کی جانے لگی ہے اور درجہ بندی کے ارتقا کی یہ سب سے اعلیٰ اور مفید شکل بھی گئی ہے۔

کتاب کے مزاج میں اس کے مصنف کے مزاج کی پوری پوری جھلک موجود ہوتی ہے۔ چنانچہ بعض کتابیں خوشی اور رنج کے جذبات پیدا کرتی ہیں اور بعض محبت اور نفرت کے لیکن مصنف کی بہ نسبت کتابوں میں ہمدردی دوستی اور وفاداری کا مادہ زیادہ ہوتا ہے کتاب کی اس خوبی کی تعریف کرتے ہوئے ایک عربی شاعر نے کہا ہے:

"جب تم تنہائی میں ہوتے ہو تو کتاب تمہاری بہترین مونس ہے۔ اگر دوستوں نے تم سے ملنا جلنا ترک کر دیا ہے تو اس وقت یہ تمہیں بہلائے گی۔ اگر کوئی راز کی بات اس کے سپرد کر دو گے تو وہ کسی سے ظاہر نہ کرے گی۔"

کتاب کا اپنا چہرہ بھی ہوتا ہے جسے سرورق کہتے ہیں یہ کتاب کا سب سے اہم اور دلکش حصہ ہے۔ ناظر کی پہلی نظر اسی پر پڑتی ہے اور اسے دیکھتے ہی وہ کتاب کے اندر کا حال جان لیتا ہے۔ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ کتاب کو وجود میں لانے میں جن

کا ہاتھ ہوتا ہے ان سب کی جھلک اس چہرہ میں نظر آتی ہے میرا مطلب یہ ہے کہ آپ کتاب کے سرورق کو غور سے دیکھئے، اس پر مصنف۔ مولف اور ناشر سب مل جائیں گے۔ اس پر تاریخ، اشاعت اور مقام اشاعت بھی دیا ہوتا ہے۔ اور اس سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ کتاب کا مضمون کیا ہے۔ مختصر یہ کہ کتاب کی فہرست مرتب کرنے میں جن جن باتوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ وہ سب کتاب کا چہرہ بتا دیتا ہے لیکن کتاب کے چہرہ کے خدوخال کو سمجھنا کوئی آسان کام نہیں ہے کتاب پڑھنے والے تو بہت ہیں لیکن یہ کم لوگ جانتے ہیں کہ کتابیں کتنی قسم کی ہوتی ہیں۔ کتابوں کے نام کی کتنی شکلیں ہیں مصنف کس کس روپ میں ظاہر ہوتا ہے ان باتوں کو جاننے کے لئے لائبریری سائنس کی دنیا میں جانا پڑے گا اور بات طویل ہو جائے گی۔

کتاب کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ جب کوئی اسے جی لگا کر پڑھتا ہے تو وہ اسے مصنف کی روح سے ملا دیتی ہے اور پھر ناظر یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ وہ مصنف سے رو برو باتیں کر رہا ہے اسے کتاب کی کرامت کہئے یا مصنف کا اعجاز۔

قاضی صاحب کی بخیر واپسی

قاضی محمد عبدالغفار صاحب جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو ہند بخیر علی گڑھ واپس آگئے ہیں اور ان کی صحت بحمداللہ اچھی ہے۔ اس لئے دفتر سے متعلق ہر قسم کی مراسلت موصوف کے نام سے یا جنرل سکریٹری کے پتے پر کی جائے ———— نائب معتمد

خبریں

حیدرآباد سوئٹزرلینڈ کی ایک لڑکی مس ارسلا ڈائیس جن کی عمر ۲۰ سال ہے۔ اردو زبان اور اس کے محاوروں پر تحقیقات کرنے کی غرض سے جنوری ۱۹۵۴ء میں ہندوستان آئیں۔ وہ اب ایک مختصر سے قیام کے لئے حیدرآباد آئی ہوئی ہیں۔ مس ڈائیس نے لندن یونیورسٹی سے اردو میں بی۔ اے آنرس کیا ہے۔ وہ گزشتہ جنوری ۱۹۵۵ء سے مسٹر آل احمد سرور کی نگرانی میں اردو زبان اور اس کے محاوروں پر تحقیقات کر رہی ہیں۔ یہاں انھوں نے عروض اور خوش نویسی بھی سیکھی ہے۔ مس ڈائیس نے اپنے مقصد کی تکمیل کی خاطر دہلی اور علی گڑھ کا بھی دورہ کیا ہے۔ اب وہ اسی مقصد کی خاطر حیدرآباد آئی ہوئی ہیں۔

معلوم ہوا ہے کہ مس ڈائیس ڈاکٹر اکبر علی خاں، ماہر امراض دماغی کے مکان واقع لال ٹیکری میں مقیم ہیں۔ ان کی طبیعت میں خاموشی اور مشرقیت کا گہرا احساس پایا جاتا ہے۔

امروہہ سجاد منزل محلہ بگلہ امروہہ میں انجمن ترقی اردو شاخ امروہہ کے زیر اہتمام ایک ادبی اجتماع ۵ رجون اتوار کے دن منعقد ہوا جس میں مقامی ادبا و شعرا کے علاوہ سید احتشام حسین صاحب رضوی پروفیسر لکھنؤ یونیورسٹی نے بھی اپنے ایک مقالہ "اردو تنقید اور جدیدیت" سے سامعین کو نوازا۔ فاضل مقالہ نگار نے ۱۹۳۰ء سے موجودہ عہد تک کے تنقیدی سرمائے اور تنقیدی رجحانات پر بے لاگ نقد و تبصرہ کیا اور مارکسی نظریہ اور عہد حاضر کے تنقید نگاروں کو رابطہ بتاتے ہوئے فرمایا کہ مارکس کا نظریہ بھی ایک ایسا نظریہ ہے جس نے ادیبوں اور تنقید نگاروں کو متاثر کیا ہے۔

حضرت روش صدیقی نے بھی مصحفی کا مخصوص طرز شاعری کے عنوان سے ایک مقالہ پیش فرمایا اور متعدد غزلوں اور نظموں سے سامعین کی ضیافت طبع کی۔

مولانا سید مصطفی مرتضیٰ صاحب امروہوی لیکچرار امام المدارس نے مرحوم مومن حسین صاحب صفی امروہوی پر ایک تحقیقی مقالہ پیش فرما کر اردو کے ایک صاحب طرز شاعر سے روشناس کرایا۔

پروگرام کے مطابق سید نقی حسن صاحب بی۔ اے ایک افسانہ "سفارش" پڑھنے والے تھے۔ مگر انھوں نے بتایا کہ ان کا افسانہ مکمل نہیں ہو سکا۔ اس لئے صدر کی اجازت سے موصوف نے ایک مضمون "ہمارا لیڈر" پیش کیا۔ اس کے بعد مولانا سید محمد عبادت صاحب کلیم [illegible] نے ایک کامیاب نظم "ناظورۂ سیاست سے ایک سوال" پیش فرمائی۔

خبریں صاف، خوش خط اور کاغذ کے ایک ہی طرف لکھ کر بھیجئے۔

تحفظ اردو کیلئے دعوت سعی و عمل

محمد عزیز الحسن صدیقی۔ سکریٹری انجمن ترقی اردو، غازی پور

گلی کوچہ، بازار اور گھروں میں غرضیکہ جدھر دیکھئے چھوٹے چھوٹے بچے سندر، آشا، ورشا، بھوگول اور اتہاس وغیرہ جیسے غیر مانوس الفاظ عام طور سے بولتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ وہ بچے ہیں جن کے والدین خود کو اردو کا بہی خواہ کہتے ہوئے فخر محسوس کرتے ہیں۔ کون نہیں جانتا کہ گھروں میں جو زبان کل بولی جاتی تھی وہی آج بھی بولی جاتی ہے۔ لیکن بعض گھروں میں ایسے بچے بھی پرورش پا رہے ہیں جو اپنی مادری زبان سمجھنے سے قاصر ہیں اور ٹھیٹھ ہندی کے ثقیل اور غیر مانوس الفاظ گویا کہ ان کے ذہن و دماغ میں پیوست ہو چکے ہیں۔ سرپرست آنکھ بند کر کے اپنے بچوں کو سرکاری اسکولوں میں داخل کر دیتے ہیں اور پھر یہ معلوم کرنے کی زحمت نہیں گوارا کرتے کہ ہمارا بچہ کیا تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچہ ہندی زبان کے ساتھ ہندو تہذیب، ہندوانہ رسم و رواج اور طور طریقے اختیار کر لیتا ہے اور دوسری طرف اپنے مذہب سے بیگانہ ہوتا جاتا ہے۔ موجودہ نصاب تعلیم کی خامیاں اور مضرتیں ثابت ہیں۔ لیکن انصاف کا تقاضہ یہ ہے کہ ہم اپنی کوتاہیوں کا بھی کھلے دل سے اعتراف کریں۔

ہندی پڑھنا یا بولنا کوئی جرم نہیں اور نہ کسی جماعت یا مذہب کی جانب سے اس کا بولنا یا پڑھنا حرام قرار دیا گیا ہے۔ اگر آج سے چند سال پیشتر ہم بے تکلف انگریزی زبان میں گفتگو کر سکتے تھے اور اس زبان کا حاصل کرنا جرم اور عیب نہیں سمجھا جاتا تھا، تو پھر آج کے جمہوری دور میں ہندی یا کسی اور ملکی زبان سے نفرت کیوں کی جائے۔ ایسی حالت میں جبکہ ہندی کو سٹیٹ کی مرکزی زبان قرار دیا گیا ہے زبان سے نفرت کیوں کی جائے اس کی ترقی کے لئے کوشش کرنا ہر ہندوستانی کا فرض ہے۔ صحیح معنوں میں جو اردو کا حامی ہوگا وہ کبھی ہندی سے نفرت نہیں کر سکتا۔ یہ غلط فہمی جتنی جلدی دور ہو جائے اچھا ہے کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے اور یہ کہ اگر یہ زبان مٹ گئی تو مسلمان صفحۂ ہستی سے حرف غلط کی طرح مٹ جائیں گے۔

مسلمان ایک الگ تہذیب رکھتا ہے۔ اس کی مذہبی زبان جدا ہے۔ اس کا تمدن امتیازی شان رکھتا ہے۔ اردو کو کسی خاص مذہب یا فرقہ کی زبان کہنا تاریخ سے ناواقفیت کا ثبوت دینا ہے۔ اردو کی تاریخ شاہد ہے کہ وہ ہندوستان کی ملی جلی تہذیب کی آئینہ دار ہے فرقہ پرستوں نے عجیب طریقہ یہ اختیار کیا ہے کہ جہاں ان کی خود غرضیوں کا پردہ فاش ہوتا ہے۔ یا انہیں کسی کو نیچا دکھانا مقصود ہوتا ہے۔ بس وہ فوراً اپنے سر کی بلا دوسرے کے سر ٹالنے لگتے ہیں۔ اپنی فرقہ پرستی پر پردہ ڈالنے کے لئے مسلمانوں کو فرقہ پرست پکارنے لگتے ہیں۔ اردو زبان سے انہیں نفرت ہے اس لئے اسے مسلمانوں کی زبان کہہ دیتے ہیں۔ اردو کے دشمن اردو کو مسلمانوں کی زبان قرار دے کر یہ سمجھتے ہیں کہ ہم نے بڑا تیر مار لیا حالانکہ وہ خوب سمجھتے ہیں کہ اگر مسلمانوں کی بقا زبانوں پر منحصر ہوتی تو وہ اب تک فنا کے گھاٹ اتر چکے ہوتے۔

مسرت کا مقام ہے کہ اردو کی ترقی کے لئے سب ہندوستانی باہمی تعاون کے ساتھ جد و جہد کر رہے ہیں اور اگر وہ ایسا کر رہے ہیں تو کسی پر احسان نہیں کر رہے ہیں بلکہ ہندوستان کے مشترکہ کلچر کو تقویت پہنچا رہے ہیں۔ سچ پوچھئے تو یہی یکجہتی اور اولوالعزمی فرقہ واریت کے خرمن پر برق بن کر گر رہی ہے۔

جب ہم چھوٹے چھوٹے بچوں کو بارش کی جگہ ورشا اور امید کی جگہ آشا بولتے ہوئے سنتے ہیں تو قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ورشا اور آشا بارش اور امید کے مقابلے میں زیادہ مقبول اور عام فہم الفاظ ہیں؟ اگر ایسا نہیں ہے اور ہرگز نہیں ہے تو اسکول میں تعلیم حاصل کرنے والے چھوٹے چھوٹے بچے یہ الفاظ کیوں بلا جھجک استعمال کرتے ہیں۔

اس بگاڑ کے اسباب کا معلوم کرنا کچھ مشکل نہیں۔ بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ اس بگاڑ میں بچوں کے سرپرستوں کی کوتاہیوں کو بھی دخل ہے۔ اگر ایک طرف ناقص نصاب تعلیم کے مضر اثرات طلباء کے ذہن و دماغ پر مرتب ہو رہے ہیں تو دوسری طرف سرپرستوں کی غفلت ان کی تعلیم کے مسئلہ کو پیچیدہ بناتی جا رہی ہے۔ بدقسمتی سے تعلیمی مسئلہ کی اہمیت کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ اگر واقعی حامیان اردو کو سود و زیاں کا احساس ہوتا اور وہ جد و جہد کے عادی ہوتے تو اردو زبان کا مسئلہ کبھی کا حل ہو گیا ہوتا۔ آج ہم وقت کی رفتار موڑنے کے قابل نہیں رہے بلکہ یہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ غلط اور صحیح کی تمیز بھی نہیں کر پاتے اور "چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی" کے اصول پر عمل کر کے خود اپنے پیروں پر کلہاڑا مار رہے ہیں۔

یہ کہنا بھی درست نہیں کہ حکومت کی بے التفاتی سے اردو جیسی عوامی اور ہمہ گیر زبان کو کوئی نقصان نہیں پہونچ سکتا۔ بلا شبہ اردو ایک عوامی زبان ہے مگر کسی زبان کے ہمہ گیر یا عوامی ہونے کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ اس کے تحفظ کی تمام کوششیں موقوف کر دی جائیں۔ اگر یہ نظریہ تسلیم کر لیا گیا ہے تو اس سے بڑھ کر ناعاقبت

اندیشہ کیا ہو سکتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ قانون کی رو سے اردو پر کسی قسم کی پابندی نہیں ہے لیکن حکومت نے اردو دشمن تحریکوں پر بھی تو روک نہیں لگایا ہے۔ بلکہ یہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ ایک حد تک ایسی تحریکوں کی ہمت افزائی کی جا رہی ہے اب تک تو ہماری نگاہوں نے یہی دیکھا ہے کہ ایک کو دبایا اور دوسرے کو ابھارا جا رہا ہے ایسے حالات میں اردو کے مسئلہ کو پس پشت ڈال دینا اور اس کی ترقی نہ دینا نہ صرف یہ کہ اردو زبان کے ساتھ ناانصافی ہے بلکہ آئندہ نسلوں پر ظلم کرنا ہے اور ہندوستانی تہذیب و تمدن کے روشن چراغ کو گل کرنا ہے۔ جس طرح روسی عوام کو قانون کی رو سے مذہبی آزادی حاصل ہے، لیکن دوسری طرف مذہب دشمن عناصر کی ہمت افزائی بھی کی جاتی ہے۔ ٹھیک اسی طرح کا برتاؤ ہمارے دیس میں اردو کے ساتھ کیا جا رہا ہے۔

جب ہم نے ایک نہیں سو بار آزمایا کہ حکومت اردو کے نام پر ایک پیسہ بھی خرچ کرنا پسند نہیں کرتی، اس کے مصنفین، ادبا اور شعرا کی ہمت افزائی کو اپنی توہین تصور کرتی ہے۔ اسکولوں اور کالجوں میں اردو کی تعلیم کے لئے آسانیاں فراہم کرنے میں بخل سے کام لے رہی ہے۔ پھر اردو دستخطی مہم کا انجام ہمارے سامنے ہے سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ صدر جمہوریہ کی جانب داری بدرجۂ انتہا کا طرح عیاں ہو چکی ہے۔ یہ اردو کی بدنصیبی نہیں تو اور کیا ہے کہ اتنے تلخ تجربات کے بعد بھی اردو کے حامی خواب غفلت سے بیدار ہونے کو تیار نہیں۔

حکومت یوپی کا ۱۹۶۹ء والا سرکلر ڈوبتے کو تنکے کا سہارا ضرور بن گیا ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اردو کا دم بھرنے والے اس سہارے کو بھی قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں، اے کاش اردو کے بہی خواہ اور ہمدرد اردو کو اس کا جائز مقام دلانے کی کوشش کرتے اور حکومت نے جو مراعات دی ہیں ان سے فائدہ حاصل کرتے۔

یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ اردو زبان ایک طرف حکومت کی بے التفاتی کا شکار ہے تو دوسری طرف نادان دوست اس کے مستقبل کو تاریک بنا رہے ہیں۔ حکومت نے جو سہولت بہم پہونچائی ہے اس سے استفادہ نہ کرنا بھی دانشمندی کے خلاف ہے۔ اردو کی ترقی چاہنے والے تمام اداروں کا فرض ہے کہ وہ عوام سے اپنا رشتہ قائم کریں، بچوں کے سرپرستوں کو تعلیم کی اہمیت اور ضرورت اور مادری زبان میں تعلیم دلانے کے فوائد بتلائیں تاکہ وہ اردو میں تعلیم دلانے کو عار نہ سمجھیں اور مخالفین کے زہریلے پروپگنڈے سے متاثر بھی نہ ہوں۔ اگر ہم اردو کے لئے مسلسل جد و جہد کرنے کے عادی ہوتے تو آج نقشہ ہی دوسرا ہوتا۔ غضب تو یہ ہے کہ سرپرست اپنے بچوں کی مادری زبان اردو لکھواتے ہوئے ہچکچاتے ہیں۔ اب تک سوائے دو چار اضلاع کے پورے صوبے میں کارکنان اردو پر جمود طاری ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ یہی رفتار رہی تو "اسکولی مہم" کی کامیابی میں کتنا زمانہ لگے گا۔ اردو کی بقا کا انحصار محض مشاعروں اور کانفرنسوں کے انعقاد پر ہوتا تو چند ہی مہینوں میں یہ مسئلہ حل ہو سکتا تھا۔ اگر صرف روٹی روٹی کہنے سے بھوک اور پانی کی رٹ لگانے سے پیاس نہیں بجھ سکتی تو پھر اردو کا نام لینے سے اردو کا مسئلہ کیوں کر حل ہو سکتا ہے۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ ہم وقت اور پیسہ کی قربانی دینے کے عادی بنیں دیکھنا یہ ہے کہ بزم مشاعرہ منعقد کرنے والوں کی نیت کیا ہوتی ہے۔ آیا اس سے اردو کی ترقی مقصود ہوتی ہے یا محض تفریح طبع بلاخوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ عام طور سے منتظمین کے پیش نظر کوئی خاص مقصد نہیں ہوتا۔ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ غیر ضروری کاموں پر وقت اور پیسہ ضائع کرنے سے احتراز کیا جائے اور وہی سرمایہ اردو اخبارات اور کتابوں کی اشاعت اور دارالمطالعوں کے قیام پر صرف کیا جائے اگر اردو کے حامیوں نے اس قسم کے ٹھوس کاموں کی طرف توجہ دی تو یقیناً ان کا شمار اردو کے محسنوں میں ہوگا

اب خاموش رہنے کا وقت نہیں ہے جمہوری دور حکومت میں اردو زبان کے ساتھ جو غیر جمہوری اور سراسر غیر آئینی سلوک ہو رہا ہے۔ وہ ناقابل برداشت ہے، حیرت کا مقام ہے کہ زیادہ تر کارکنان اردو خاموشی کے ساتھ اردو کی تباہی کا منظر دیکھ رہے ہیں، مگر عمل کی دنیا سے دور رہ کر اردو کے حال زار پر آنسو بہانا ہی کافی سمجھتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اردو کے کارکنوں کو اب تک اردو کا مستقبل بھیانک ہی نظر آ رہا ہے۔ حالانکہ بارہا ایسے بادر ہوا خیالات کی تردید کی جا چکی ہے اور اب تو ایسے خیالات کو مضحکہ خیز ہی نہیں تو ہم پرستی کا نتیجہ قرار دیا جا چکا ہے جو لوگ بھارت میں اردو کی بقا کو ناممکن تصور کرتے ہیں۔ انھیں آزادی ہند کی مثال سامنے رکھنی چاہئے۔ جب آزادی خواہ جماعتیں آزادی کی باتیں کیا کرتی تھیں تو عام خیال یہ تھا کہ نعروں اور تجاویز پاس کرنے سے کہیں ملک آزاد ہوا کرتے ہیں۔ لیکن ہم نے دیکھا کہ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو نہ صرف یہ کہ غیر ملکی اقتدار کا خاتمہ ہوا بلکہ سرزمین ہند پہ آفتاب آزادی طلوع ہو کر رہا

آج اردو زبان کے دشمن اور مخالفین ایک کیمپ میں نظر آتے ہیں۔ لیکن اس کے ہمدرد اور جاں نثار مختلف کیمپوں میں بٹے ہوئے ہیں ابھی بحث و مباحثہ کا دروازہ اسی طرح کھلا ہوا ہے۔ حیرت تو اس پر ہے کہ آج تک حامیان اردو اتحاد و اتفاق کی دولت سے محروم ہیں اور کوئی صحیح راہ عمل نہ متعین کر سکے۔

انجمن ترقی اردو کی شاخ کہاں نہیں قائم ہے مگر یہ دیکھ کر دکھ ہوتا ہے کہ بجز چند اضلاع کے کسی جگہ اردو کے لئے موثر جدوجہد نہیں کی جا رہی ہے کیا شاخوں کا کام یہی رہ گیا ہے کہ سال بسال انتخاب کر کے عہدے تقسیم کر دیا کریں۔ یہاں یہ کہے بغیر بھی نہیں رہا جا سکتا کہ انجمن ترقی اردو کے ساتھ دوسری انجمنوں نے تعاون کرنے میں بخل سے کام لیا البتہ جمعیۃ علماء کے کارکنوں نے حتی الامکان ساتھ دیا۔ بہتر ہوتا کہ انجمن ترقی اردو ہند ان تمام جماعتوں، مدارس، [illegible] ادبا اور شعراء کا کنونشن طلب کرتی جن کے دلوں میں اردو کا درد ہے اور جلد از جلد مناسب لائحہ عمل مرتب کر کے کارکنوں کے سامنے پیش کرتی۔

مگر بد قسمتی سے مرکزی انجمن ترقی اردو ہند نے انجمن ترقی اردو کے پیش کردہ مطالبات کا جواب دینے کی زحمت گوارا نہ فرمائی۔ لیکن اس کے بعد ہی سے حکومت اترپردیش کے رویہ میں تبدیلی پیدا ہونے لگی۔ محکمۂ تعلیم یوپی نے ۱۹۶۸ء میں یہ سرکلر جاری کیا کہ "اگر کسی بیسک پرائمری اسکول میں چالیس یا کسی کلاس میں دس لڑکے اردو پڑھنا چاہیں تو انھیں اردو ہی میں تعلیم دی جائے گی"۔

اگر غور کیا جائے تو اس سرکلر کے بعد بھی ہمارے کل مطالبات پورے نہیں ہوتے بلکہ اس کے بعد بھی بہت کچھ کرنا باقی ہے یہ سرکلر جولائی ۱۹۶۸ء میں جاری ہوا اور پھر اس کے بعد جولائی ۱۹۶۹ء میں ڈائرکٹر تعلیمات اترپردیش نے پانچویں کرم (نصاب تعلیم) کے صفحہ ۲ پر یہ لکھ کر بیسک اسکولوں میں ذریعہ تعلیم ہندی ہوگی بیک وقت اردو کی جڑوں پر کلہاڑا چلایا اور [illegible] کو چیلنج بھی کیا ہے۔ یہ تضاد بھی اردو کی راہ میں زبردست رکاوٹ ہے اور یہ کہنا حقیقت کے خلاف نہ ہوگا کہ ایک ہاتھ سے دے کر دوسرے ہاتھ سے لینے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

میرے خیال میں اردو کے ان تمام حامیوں کو جو اسمبلی کے ممبر ہیں، حکومت کے اس طرز عمل کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنی چاہئے۔ حکومت سے یہ بھی مطالبہ کیا جانا چاہئے کہ وہ اپنے ۱۹۶۸ء والے جی او کے بارے میں افسران تعلیم سے دریافت کرے کہ انھوں نے اس پر کہاں تک عمل کیا اور یہ کہ صوبہ کے کتنے اسکولوں میں شرط پوری ہونے کے باوجود اردو نہیں رائج کی گئی۔ اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ افسران متعلقہ اپنی ذمہ داری محسوس کریں گے۔

بستی اردو کانفرنس کے بعد آئے دن اخبارات میں مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں کہ آئندہ جولائی میں جب اسکول کھلیں تو ہم اپنے بچے اسکولوں میں داخل کرائے جائیں۔ حالانکہ امسال عام جون ہی کو اسکول کھل چکے ہیں۔ اس لئے اگر جلد ہی کوشش نہ کی گئی تو مشکلات پر قابو پانا مشکل ہوگا۔

عام طور سے بازاروں میں نصاب کی کتابیں نہیں مل رہی ہیں جس کی وجہ سے طلباء کو دقتوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ اس لئے کتابوں کی فراہمی کی طرف بھی توجہ دینی چاہئے۔ نصاب کی اصلاح بھی ہماری مہم کا ضروری جزو ہونا چاہئے۔ ورنہ ساری محنت پر پانی پڑ جائے گا۔

بیسک پرائمری اسکول میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد جب طالب علم جونیر ہائی اسکول میں داخل ہوتا ہے تو وہاں اختیاری مضمون صرف ایک ہے۔ یوں تو لازمی مضمون کے علاوہ چار اختیاری مضامین ہیں لیکن ان میں سے صرف ایک مضمون لیا جا سکتا ہے۔ بڑی دقت یہ ہے کہ اگر طالب علم اردو لینا چاہے تو انگریزی نہیں لے سکتا ظاہر ہے کہ کوئی طالب علم انگریزی کو نظر انداز بھی نہیں کرے گا۔ ایسی صورت میں کسی طالب علم نے بیسک اسکول میں پانچویں کلاس تک اردو میں تعلیم حاصل کی اور چھٹویں کلاس میں اردو کے لئے کوئی گنجائش نہ ہونے کے سبب وہ اردو کو اختیاری مضمون کے طور پر نہ لے سکا تو اس کی پوری محنت رائگاں چلی جائے گی۔ پرائمری اسکولوں میں مشروط طور پر اردو تعلیم کی اجازت اور جونیر اسکول کے نصاب سے بیک جنبش قلم خارج کر دینے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ عوام میں بددلی پھیل جائے گی اور کارکنوں کو بھی مصیبت سے دوچار ہونا پڑے گا۔ اگر واقعی حکومت اردو کو اس کا جائز مقام دینا چاہتی ہے تو اس کا فرض ہے کہ حامیان اردو کے مطالبات تسلیم کرے اور ان کی تمام شکایات کا ازالہ کر کے اپنی بدنامی کو نیک نامی سے بدلنے کی کوشش کرے۔

دو سال پہلے جونیر ہائی اسکولوں میں اردو کے لئے پوری گنجائش تھی۔ لیکن اب جبکہ حکومت یوپی نے اپنی پالیسی نرم کر دی ہے۔ اس طرح کی پابندی کے جواز کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی میں نے اس سلسلے میں ذمہ دار شخصیتوں سے خط و کتابت کی تو معلوم ہوا کہ حکومت یوپی نے دوبارہ اجازت دے دی ہے کہ طالب علم اردو اختیاری مضمون لے سکتا ہے۔ لیکن اب تک اس سلسلے میں کوئی سرکلر انسپکٹروں یا ڈسٹرکٹ بورڈ کے چیرمینوں کے نام نہیں جاری کیا گیا ہے۔ سرپرستوں اور کارکنوں نے تو اطمینان کا سانس لیا اور ان کو یقین دلا دیا گیا کہ گھبراؤ نہیں، حکومت غافل نہیں ہے، لیکن افسران تعلیم کو حکومت کی پالیسی کا علم نہ ہو تو اس سے فائدہ ہی کیا۔

اگر فی الحقیقت سرکلر جاری ہو چکا ہے تو خوشی کی بات ہے اور امید ہے کہ بیسک اسکولوں کے ساتھ جونیر اسکولوں میں بھی اردو رائج ہو جائے گی۔ ورنہ یہ سال بھی حامیان اردو کے لئے مایوسی اور ناامیدی کا سال ہوگا۔

تبصرے

جس کتاب کی دو جلدیں تبصرے کے لئے وصول نہیں ہوں گی

افسوس ہے کہ اس کتاب پر تبصرہ شائع نہیں ہو گا

ذکرِ غالب:۔ مالک رام۔ ناشر: مکتبہ جامعہ، دہلی
قیمت تین روپے

غالب پرستی اور غالب فہمی کے اس دور میں ایسی کتابوں کی سخت ضرورت ہے جو غالب کی شخصیت کو تاریخی حقائق کی روشنی میں پیش کر سکیں۔ مالک رام کی کتاب "ذکرِ غالب" اس اہم ضرورت کو بڑی خوبی سے پورا کرتی ہے۔

پیشِ نظر کتاب "ذکرِ غالب" تیسرا اڈیشن ہے۔ پہلا اڈیشن سو صفحات پر مشتمل تھا۔ اب ضخامت تین سو کے قریب ہو گئی ہے اور جتنے صفحات بڑھائے گئے ہیں، اسی اعتبار سے کتاب کی جامعیت میں بھی اضافہ ہو گیا ہے۔

مالک رام، غالب کی عظیم شخصیت کے رازداں ہیں اور غالب پرست ہونے کے باوجود اس کی ناجائز مداحی سے گریز کرتے ہیں۔ غالب کی زندگی سے متعلق معلومات کافی دیر سے جمع کی گئیں اور حالی کی "یادگارِ غالب" کے بعد بھی اس طرف فوراً توجہ نہیں کی گئی۔

مالک رام صاحب نے اس طرف کافی توجہ کی ہے اور چونکہ انھوں نے غالب کے فکر و فن پر کچھ نہیں لکھا ہے، صرف "ذکر" پر اکتفا کیا ہے جو دراصل اس کتاب کا موضوع ہے۔ لیکن بعض اشارے اس بات کے شاہد ہیں کہ وہ اس عنوان پر بھی سیر حاصل بحث کر سکتے ہیں۔ کتاب میں اکثر مقامات پر تحقیقی اور ایک حد تک نظریاتی اختلاف کی گنجائش ہے۔ بہادر شاہ ظفر کالے صاحب کے مرید نہیں تھے، کالے صاحب کے والد غلام قطب الدینؒ کے مرید تھے۔ عبد الصمد کی استادی سے متعلق بھی اور شواہد کی ضرورت ہے۔ اگر کتاب میں تلامذۂ غالب کا بہت مختصر بھی شامل ہوتی تو کتاب کی اہمیت بہت بڑھ جاتی۔ کتاب کے آخر میں اشاریہ کا اضافہ قابلِ تقلید ہے۔ ہماری علمی اور تاریخی کتابیں عموماً اشاریہ سے خالی ہوتی ہیں۔ حالانکہ اشاریہ قاری کی بہت سی مشکلیں آسان کر دیتا ہے۔ اشاریہ میں حکیم غلام نجف خان کا نام سہواً رہ گیا ہے۔ ذکرِ غالب کو پڑھے بغیر غالب پر مطالعہ نامکمل رہے گا۔

دلِ رسوا:۔ اختر انصاری اکبرآبادی۔ ناشر حلقہ اربابِ فکر، تین ہٹی کراچی۔ قیمت دو روپے

اختر انصاری نام کی دو شخصیتیں محفلِ ادب کی زینت ہیں۔ ایک اختر انصاری دہلوی جنھوں نے آج سے پندرہ سال قبل اپنے افسانوں، قطعوں اور بدرنگ نظموں اور غزلوں کی بدولت جدید اردو ادب میں اپنی ایک حیثیت متعین کر لی اور جن کے اس قسم کے تڑپا دینے والے اشعار سیکڑوں کی تعداد میں یاد آتے رہتے ہیں

یادِ ماضی عذاب ہے یارب — چھین لے مجھ سے حافظہ میرا
حالِ دل پوچھ کر رلائے کوئی — پھر طبیعت میں کچھ گرانی ہے

دوسرے اختر انصاری اکبرآبادی ہیں جو کراچی سے ماہنامہ "مشرب" کے نام سے ایک رسالہ نکالتے ہیں۔ "دلِ رسوا" انھیں کے لائقِ مطالعہ کلام کا مجموعہ ہے۔ کتاب کے دامن پر ایک سید نقاد کی اس کے دو صفحے کا دیباچہ یا تعارف بھی جو جناب خالد انصاری کے قلم کی تراوش ہے۔ یہ دیباچہ بغیر شاعر کے کلام پڑھے ہوئے نہایت ہی غیر ذمہ دارانہ طور پر لکھا گیا ہے جس سے نہ تو شاعر کی شخصیت سامنے آتی ہے اور نہ اس کے کلام کے بنیادی عناصر کو تجزیہ کرنے میں کوئی مدد ملتی ہے۔ اس نوع کے دیباچے دواؤں کے اشتہارات سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔ خالد انصاری نے اپنے مخصوص صحافتی انداز میں اس کتاب کا جو اشتہار لکھا ہے اس کے بعض فقرے قابلِ توجہ ہیں: "پہلے اختر انصاری اکبرآبادی (آگرہ) میں ہوا کرتے تھے اور اب کراچی میں ہوتے ہیں۔ پہلے ادب تخلیق کرتے تھے اب ادب لکھواتے اور چھاپتے بھی ہیں" "اور اب کہ 'دلِ رسوا' کو رسوا سربازار بنانے پر تلے ہوئے ہیں۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ کراچی کے تمام ادبی حلقوں میں ایک ایک زبان پر انہی کا نام اور کلام ہوگا۔ قلم کے نخیلوں کے لئے یہ مقام عبرت ہے"۔ قلم کے نخیلوں کو عبرت دلانے کے بجائے آخر میں قلم کے اس سخی (اختر انصاری اکبرآبادی) کو اسی سخاوت سے جس سے یہ شاباشی دے چکے ہیں، پرہیز کرنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ "وہ خیال کو فکر اور فن کی بھٹی میں زیادہ دیر تک پکانے اور دھیمی دھیمی آنچ پر تپا دینے کی زحمت گوارا کریں تو اس کے کندن بننے میں کس کو کلام ہو" [illegible] میں اسی قسم کے ذکا [illegible] اور [illegible] کے نمونے ملتے ہیں۔

انجمن کی نئی کتابیں

ہندوستانی سماجیات

اس کتاب میں ہندوستانی سماج کی سرگزشت بیان کی گئی ہے اور مسلح سدھار کے مسائل پر تنقیدی تشریح کے ساتھ ساتھ اس کی ضرورت، اہمیت اور افادیت پر بھی بحث کی گئی ہے۔

اس کتاب کے مرتب ڈاکٹر جعفر حسین پروفیسر جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن میں جو عمرانیات کے عالم اور اس موضوع پر لکھنے والوں میں بڑی شہرت رکھتے ہیں۔ کتاب کی افادیت مسلم ہے

(قیمت مجلد چار روپے آٹھ آنے)

سیاسیات کے اصول

اردو زبان میں ایک مستند تالیف ہے جو اس موضوع کے ممتاز ماہر پروفیسر ہارون خاں صاحب شروانی نے مرتب کی ہے جو تین حصوں میں منقسم ہے پہلے حصے میں راج یا مملکت کے متعلق نظریات اور دوسرے میں حکومت کے اجزائے ترکیبی پر بحث کی گئی ہے اور دنیا کے مختلف دستوروں، خصوصاً اپنے ملک کے نئے جمہوری دستور سے مثالیں دے کر حکومت کے مختلف حصوں کو واضح کیا گیا ہے۔ تیسرے حصے میں بین المملکت کے اصول کی تاریخ اور اس کے موزوں روپ پر نظر ڈالی گئی ہے،

یہ کتاب ایک بڑی کمی کو پورا کرتی ہے اور عام پڑھنے والوں اور طلبا دونوں کے لئے بہت مفید ہے۔

حصہ اول ۲/ روپے، حصہ دوم ۲/ روپے حصہ سوم ۱/۸ روپے

ادبی و قومی تذکرے

پنڈت کشن پرشاد کول کے مضامین کا دوسرا مجموعہ ہے جس میں ۱۱۔ ادبی مضامین ہیں جن کا مطالعہ اردو ادب اور اس کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے نہ صرف مفید ہے بلکہ ان کی معلومات میں اضافہ کا بھی سبب ہوگا۔

قیمت مجلد تین روپے

اردو ادب کی تاریخ

ہندی زبان میں اردو ادب کی یہ تاریخ سید احتشام حسین صاحب رضوی نے مرتب کی ہے جو ہندی جاننے والوں کے لئے بہت مفید ہے اور اس کے مطالعے سے ان غلط فہمیوں کا خود بہ خود ازالہ ہو جاتا ہے جو اردو زبان اور اس کے ادب سے متعلق پھیلائی گئی ہیں۔

قیمت مجلد سات روپے آٹھ آنے

میر تقی میر

(مرتبہ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی۔ دہلی یونیورسٹی)

ملک کے بہترین ادیب اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ میر کے متعلق ڈاکٹر فاروقی کا مطالعہ بہت گہرا اور وسیع ہے اور اس کے دیکھنے ہی سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ آج تک میر کی سوانح اور کلام کے متعلق اس سے بہتر کتاب نہیں لکھی گئی۔

اس کتاب کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ فاضل مولف نے میر کے زمانے کے تاریخی حالات کو ان کی پوری زندگی اور شاعری کا پس منظر بنایا ہے اور اس طرح ایک تاریخی فریم میں میر کی سیرت کا عکس پیش کیا ہے۔ ابھی تک اردو ادب میں بہت کم ایسی کتابیں لکھی گئی ہیں جن میں تاریخی پس منظر کے ذریعے سے سیرت اور کردار کا مطالعہ کیا گیا ہے۔ انجمن اس بات کو اپنا ایک کارنامہ سمجھتی ہے کہ اس نے ڈاکٹر فاروقی سے ایک ایسی اچھی کتاب لکھوائی جس نے تاریخ ادب کے مطالعے کا ایک نیا راستہ پیدا کر دیا۔

(قیمت بارہ روپے فی جلد)

احوال غالب

(مرتبہ ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو)

غالبیات کے اس سلسلے کی پہلی کتاب ہے جو انجمن شائع کرنا چاہتی ہے۔ ملک میں اصحاب ذوق اور اہل نظر نے اس کتاب کا بہت پرجوش خیر مقدم کیا ہے۔ فاضل مولف غالبیات پر بہت وسیع نظر رکھتے ہیں اور اس موضوع کے مسلمہ ماہرین میں ہیں جس محنت اور وسعت نظر کے ساتھ یہ کتاب مرتب کی گئی ہے اس کا اعتراف ملک کے بہترین اہل علم اور ادیبوں نے کیا ہے۔

(قیمت نو روپے فی جلد)

پرنٹر پبلشر قاضی عبدالغفار نے نیشنل پرنٹرس کمپنی علی گڑھ میں چھپوا کر مرکزی انجمن علی گڑھ سے شائع کیا۔